

تَفْہِیْمُ الْقُرْآنِ

(۹۳)

یوسف

(از ابتدائے سورہ ۵)

اس سورہ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بھی زمانہ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی جبکہ قریش کے لوگ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں یا بھلا وطن کریں یا قید کر دیں۔ اُس زمانہ میں بعض کفار مکہ نے (غالباً یہودیوں کے اشارے پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آپ سے سوال کیا کہ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا کیا سبب ہوا۔ چونکہ اہل عرب اس قصہ سے ناواقف تھے، اس کا نام و نشان تک ان کے اہل کی روایات میں نہ پایا جاتا تھا، اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بھی اس سے پہلے کبھی ان کا ذکر نہ سنا گیا تھا، اس لیے انھیں توقع تھی کہ آپ یا تو اس کا مفصل جواب نہ دے سکیں گے، یا اس وقت ٹال مٹول کر کے بعد میں کسی یہودی سے پوچھنے کی کوشش کریں گے، اور اس طرح آپ کا بھرم کھل جائے گا۔ لیکن اس امتحان میں انھیں الٹی منہ کی کھاتی پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ اپنے نبی پر اہام فرادیا، بلکہ مزید برآں ٹھیک اس موقع پر جبکہ یہ لوگ آپ کے ساتھ براہِ درانِ یوسف کا سامعہ کر رہے تھے، اس قصے کو ان پر چسپاں بھی کر دیا۔

پس یہ قصہ دو اہم مقاصد پر مشتمل ہے :

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت، اور وہ بھی مخالفین کا اپنا منہ مانگا ثبوت بھم پہنچایا جائے، اور ان کے خود تجویز کردہ امتحان میں یہ ثابت کر دیا جائے کہ آپ سنی سنانی

باتیں بیان نہیں کرتے بلکہ فی الواقع آپ کو دنی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو سورہ کی تفسیر میں بھی صاف صاف واضح کر دیا گیا ہے اور خاتمہ کلام پر بھی پورے زور کے ساتھ اس کی تصریح کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ سرورِ ان قریش اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اُس وقت جو معاملہ چل رہا تھا اس پر برادرانِ یوسفؑ اور یوسف علیہ السلام کے قصے کو چسپاں کرتے ہوئے قریش والوں کو بتایا جائے کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو یوسفؑ کے بھائیوں نے ان کے ساتھ کیا تھا، مگر جس طرح وہ خدا کی مشیت سے لڑنے میں کامیاب نہ ہوئے اور آخر کار اسی بھائی کے قدموں میں آ رہے جس کو انہوں نے کبھی انتہائی بے رحمی کے ساتھ کنویں میں پھینکا تھا، اسی طرح تمہاری زور آزمائی بھی خدائی تدبیر کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے گی اور ایک دن تمہیں بھی اپنے اسی بھائی سے رحم و کرم کی بھیک مانگنی پڑے گی جسے آج تم مٹا دینے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ مقصد بھی سورہ کے آغاز اور اختتام دونوں میں صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے، چنانچہ آغاز میں فرمایا کہ لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّامِعِينَ (یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصے میں ان پوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں) اور آخر میں فرمایا کہ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (ان کے حالات میں ذی ہوش لوگوں کے لیے ایک عبرت آموز سبق ہے)۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کے قصے کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملے پر چسپاں کر کے قرآن مجید نے گویا ایک سرخ پشینگوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرفِ صحیح ثابت کر کے دکھا دیا۔ اس سورہ کے نزول پر ڈیڑھ دو سال ہی گزرے ہوں گے کہ قریش والوں نے برادرانِ یوسفؑ کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی اور آپ کو مجبوراً ان سے جان بچا کر مکہ سے نکلنا پڑا۔ پھر ان کی توقعات کے بالکل خلاف آپ کو بھی جلاوطنی میں ویسا ہی عروج و افتاد نصیب ہوا جیسا یوسفؑ علیہ السلام کو ہوا تھا۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک ٹھیک

وہی کچھ پیش آیا جو مصر کے پائے تخت میں یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائیوں کی آخری
حضور کے موقع پر پیش آیا تھا۔ وہاں جب براہِ ران یوسفؑ اتنی عجیب و در ماندگی کی حالت میں
ان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ
يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ، ”ہم پر صدقہ کیجئے امداد دہ کرنے والوں کو نیک جزا دیتا ہے“ تو یوسف
علیہ السلام باوجود اس کے کہ ان کے ظلم و ستم کا انتقام لینے پر پوری طرح قادر تھے مگر آپ نے یہ کہہ کر
انہیں معاف کر دیا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ، يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّحِمِيْنَ
”آج تم پر کوئی گرفت نہیں، امداد تمہیں معاف کرے، وہ سب گم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا
ہے۔“ اسی طرح یہاں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریشی سرگرم کھڑے ہوئے
تھے اور آنحضرت ان کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے پر قادر تھے تو آپ نے ان سے پوچھا تمہارا
کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انہوں نے عرض کیا اخ کو یہ عروا بن اخ کو یہ
آپ ایک عالی ظرف بھائی ہیں، اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا فَاخِي
اقول لكم كما قال يوسف لا خوتہ، لا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ، اذْهَبُوا فَاَنْتُمْ
الطَّلَاقُ۔ ”میں تمہیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی
گرفت نہیں، جاؤ تمہیں معاف کیا۔“

یہ دو پہلو قواس سورہ میں مقصدی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس قصہ کو بھی قرآن مجید قصہ گوئی و تاریخ نگاری کے طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے قاصد کے مطابق وہ اسے اپنی اصل دعوت کی تبلیغ میں استعمال کرتا ہے۔

وہ اس پوری داستان میں یہ بات نمایاں کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت یوسفؑ کا دین وہی تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی چیز کی طرف وہ بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف آج محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔

پھر وہ ایک طرف حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے کردار اور دوسری طرف پردہ ان یوسف

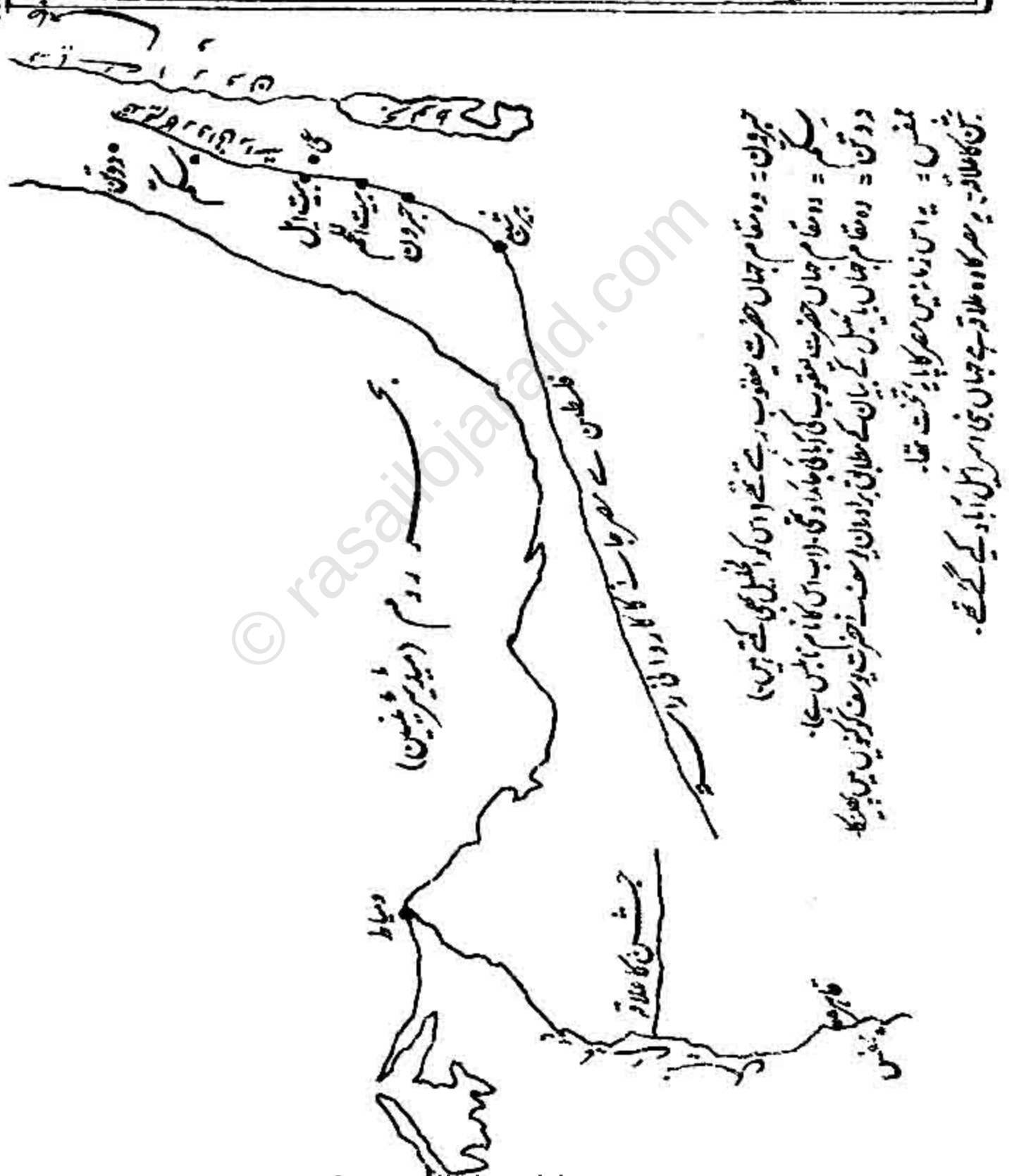
قافلہ تجارت، عزیز مصر، اس کی بیوی، بیگمات مصر، اور حکام مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلہ میں رکھ دیتا ہے اور محض اپنے انداز بیان سے سامعین و ناظرین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام، یعنی خدا کی بندگی اور حساب آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت، اور دنیا پرستی اور غلو و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتے ہیں، اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں سے کس نمونے کو پسند کرتا ہے۔

پھر اس قصے سے قرآن حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کرتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہر حال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدبیروں سے اس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا مگر نتیجہ میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی حبیب ان کو کنوئیں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانسٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا مگر فی الواقع انھوں نے یوسفؑ کو اس بام عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لاکھڑا کیا جس پر اللہ ان کو پہنچانا چاہتا تھا، اور اپنی اس حرکت سے انھوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسفؑ کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد بچائے اس کے کہ وہ عورت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے انھیں درامت شرمساری کے ساتھ اسی بھائی کے سامنے سرنگو ہوتا پڑا۔ عزیز مصر کی بیوی یوسفؑ کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو ان سے امتقام لے ہی تھی مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تخت سلطنت پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے ملک کی مرتبہ کھلانے کے بجائے اس کو علی الاعلان اپنے اعتراف و خیریت کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے

بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دنیا مل کر بھی اس کو نہیں گرا سکتی، بلکہ دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور فنی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور ان لوگوں کے حصہ میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنہوں نے اسے گرا نا چاہا تھا۔ اور اسی طرح اس کے برعکس، خدا جسے گرا نا چاہتا ہے اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی، بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں اسی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اس حقیقت حال کو اگر کوئی سمجھ لے تو اسے پہلا سبق تو یہ ملے گا کہ انسان کو اپنے مقاصد اور اپنی تدبیر، دونوں میں ان حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے جو قانون الہی میں اس کے لیے مقرر کر دی گئی ہیں۔ کامیابی دنیا کا می تو اللہ کے ہاتھ ہے، لیکن جو شخص پاک مقصد کے لیے سیدھی سیدھی جائز تدبیر کرے گا وہ اگر ناکام بھی ہو تو بہر حال ذلت و رسوائی سے دوچار نہ ہوگا، اور جو شخص ناپاک مقصد کے لیے ٹیڑھی تدبیریں کرے گا وہ آخرت میں تو یقیناً رسوا ہوگا مگر دنیا میں بھی اس کے لیے رسوائی کا خطرہ کچھ کم نہیں ہے۔ دوسرا اہم سبق اس سے توکل علی اللہ اور تعویض الی اللہ کا ملتا ہے جو لوگ حق اور صداقت کے لیے سعی کر رہے ہوں اور دنیا انہیں شاد سے پرتی ہوئی ہوئی ہو وہ اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو انہیں اس سے غیر معمولی تسکین حاصل ہوگی اور مخالف طاقتوں کی بظاہر نہایت خوفناک تدبیروں کو دیکھ کر وہ قطعاً ہراساں نہ ہوں گے بلکہ نتائج کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے اپنا اخلاقی فرض انجام دے دیے چلے جائیں گے۔

اس قصے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مختصراً اس کے متعلق کچھ تاریخی و خبرانی معلومات بھی ناظرین کے پیش نظر ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت یعقوب کے بیٹے، حضرت اسحاق کے پوتے اور حضرت ابراہیم کے پر پوتے تھے۔ توراۃ کے بیان کے مطابق (جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے) حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ ان میں سے حضرت یوسف اور اُن کے چھوٹے بھائی بن یمن ایک بیوی سے، اور باقی دس دوسری بیویوں سے تھے۔ فلسطین میں حضرت یعقوب کی جائے قیام جبرون کی وادی میں تھی

جہاں حضرت اسحق اور ان سے پہلے حضرت ابراہیم رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت یعقوب کی کچھ زمین سکیم میں بھی تھی۔ بائبل کے علماء کی تحقیق اگر درست مانی جائے تو حضرت یوسف کی پیدائش ۱۹۰۶ء قبل مسیح کے مگ جگ زمانے میں ہوئی اور ۱۸۹۰ء ق م کے قریب زمانے میں وہ واقعہ پیش آیا جس سے اس قصہ کی ابتدا ہوتی ہے، یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنوئیں میں پھینکا جانا



مہرون = وہ مقام جہاں حضرت یعقوب رہتے تھے (اس کو ٹھیل بھی کہتے ہیں)۔
 سکیم = وہ مقام جہاں حضرت یعقوب کی اہلیہ جادو تھی۔ (اب اس کا نام نابلس ہے)۔
 دو تین = وہ مقام جہاں بائبل کے بیان کے مطابق براہمان یوسف نے حضرت یوسف کو کنوئیں میں پھینکا۔
 ممفس = یہ اس زمانہ میں مصر کا پای تخت تھا۔
 بن کا علاقہ = یہ مصر کا وہ علاقہ ہے جہاں بنی اسرائیل آباد کیے گئے تھے۔

اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی۔ جس کنویں میں وہ پھینکے گئے وہ بامیل اور تلمود کی روایات کے مطابق سکم کے شمال میں دو تن کے قریب واقع تھا اور جس قافلے نے انھیں کنویں سے نکالا وہ جلعاد (شرق اردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔

مصر پر اس زمانہ میں پندرہویں خاندان کی حکومت تھی جو مصری تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (Hyksos Kings) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ شام کے رہنے والے سامی نسل تھے۔ عرب مورخین اور مفسرین قرآن نے ان کے لیے عمالیق کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کی خانگی نزاعات کے سبب انھیں وہاں اپنی پادشاہی قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسف کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر نبی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ملک کے بہترین ذخیرہ علاقے میں آباد کیے گئے اور ان کو وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا، کیونکہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔ اس کے علاوہ مصری تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے ہم عصر بادشاہ کو ”فرعون“ کے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کیونکہ ”فرعون“ مصر کی مذہبی اصطلاح تھی اور یہ لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے۔ لیکن بامیل میں غلطی سے اس کو بھی ”فرعون“ ہی کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ ”فرعون“ ہی تھے۔

موجودہ زمانہ کے محققین جنھوں نے بامیل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں جس فرمانروا کا نام مصری تاریخ میں اپوفیس (Apophis) ملتا ہے وہی حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دار السلطنت اس زمانہ میں ممفس تھا جس کے کنڈر طاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل

کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ جب حضرت یوسف مصر کے حکمران ہوئے تو انھوں نے حضرت یعقوب کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جشن یا گوشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔

یوسف علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بائبل اور تلمود میں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا بیان بہت کچھ مختلف ہے، مگر قصے کے اہم اجزاء میں تینوں متفق ہیں۔ ہم اپنے حواشی میں حسب ضرورت ان اختلافات کو واضح کرتے جائیں گے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

۱۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا رد عاصف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم (اہل عرب) اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔ اسے محمد! ہم اس قرآن

لے قرآن مصدر ہے قرأ یقرأ سے۔ اس لیے اس کے اصل معنی ہیں ”پڑھنا“ مصدر کو کسی چیز کے لیے جب نام کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس شے کے اندر معنی مصدری بدرجہ کمال پایا جاتا ہے مثلاً حبیب کسی شخص کو ہم بہادر کہنے کے بجائے ”بہادری“ کہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر شجاعت ایسی کمال درجہ کی پائی جاتی ہے کہ گویا وہ اور شجاعت ایک چیز ہیں۔ پس اس کتاب کا نام ”قرآن“ (پڑھنا) رکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عام و خاص سب کے پڑھنے کے لیے ہے اور بکثرت پڑھی جانے والی چیز ہے۔

۲۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کتاب خصوص طور پر اہل عرب ہی کے لیے نازل کی گئی ہے، بلکہ اس فقرے کا اصل مدعا یہ ہے کہ اے اہل عرب تمہیں یہ باتیں کسی یونانی یا ایرانی زبان میں تو نہیں سنائی جا رہی ہیں، تمہاری اپنی زبان ہی میں ہیں، لہذا تم زتویہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ یہ باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور نہ ہی ممکن ہے کہ اس کتاب میں انجاز کے جو پہلو ہیں جو اس کے کلام الہی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، وہ تمہاری نگاہوں پر پوشیدہ رہ جائیں۔

بعض لوگ قرآن مجید میں اس طرح کے فقرے دیکھ کر اعتراض پیش کرتے ہیں کہ یہ کتاب تو اہل عرب کے لیے ہے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

کو تمھاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں، ورنہ اس سے پہلے تو ان چیزوں سے تم بالکل ہی بے خبر تھے بلکہ

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ ابا جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند دیکھے ہیں اور دیکھا کہ وہ مجھے بجا رہے ہیں۔ جواب میں اس کے باپ نے کہا، بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنا اور نہ وہ تیرے درپے اُزار ہو جائیں گے، ہوشیار رہنا کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا کہ خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۰) میرا بنی عرب کے لیے نازل ہی نہیں کی گئی ہے، پھر اسے تمام ان نون کے لیے ہدایت کیسے کہا جاسکتا؟ لیکن بعض ایک سرسری سا اعتراض ہے جو حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کے بغیر جڑ دیا جاتا ہے۔ ان نون کی عام ہدایت کے لیے جو چیز بھی پیش کی جائے گی وہ بہر حال انسانی زبانوں میں سے کسی ایک زبان ہی میں پیش کی جائے گی، اور اس کے پیش کرنے والے کی کوشش یہی ہوگی کہ پہلے وہ اس قوم کو اپنی تسلیم سے پوری طرح متاثر کرے جس کی زبان میں وہ اسے پیش کر رہا ہے، پھر وہی قوم دوسری قوموں تک اس تعلیم کے پہنچنے کا وسیلہ بنے۔ یہی ایک فطری طریقہ ہے کسی دعوت و تحریک کے بین الاقوامی پیمانے پر پھیلنے کا۔

(حواشی صفحہ ۱۲۱) نہ سورہ کے و باجے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ کفار کہیں سے بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے، بلکہ اپنے نزدیک آپ کا بھرم کھولنے کے لیے، غالباً یہودیوں کے اشارے پر، آپ کے سامنے اچانک یہ سوال پیش کیا تھا کہ بنی اسرائیل کے مصر پہنچنے کا کیا سبب ہوا۔ اسی بنا پر ان کے جواب میں تاریخ بنی اسرائیل کا یہ باب پیش کرنے سے پہلے تمہیں آیہ فقرہ ارشاد ہوا ہے کہ اے محمد! تم ان واقعات سے بے خبر تھے، دراصل یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعہ سے تمہیں ان کی خبر دے رہے ہیں۔ بظاہر اس فقرے میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن اصل میں رسول کے ہونے ان فیاضین کی طرف ہے جن کو یقین نہ تھا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے۔

۱۳۵ اس سے مراد حضرت یوسفؑ وہ دس بھائی ہیں جو دوسری ماؤں سے تھے۔ حضرت یعقوب کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسفؑ کے گھر رکھتے ہیں اور اخلاق کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی ناروا کارروائی کرنے میں انھیں کچھ تامل ہو، اس لیے انھوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرمادیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب تھا کہ سورہ سے مراد حضرت یعقوبؑ، چنانچہ مراد ان کی بیوی (حضرت یوسفؑ کی ماں) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں۔

کرے گا اور تجھے باتوں کی تر کو پہنچا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کریگا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے دادا اور پردادا ابراہیم اور اسحاق پر کر چکا ہے۔ یقیناً تیرا رب علیم اور حکیم ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصہ میں ان پوچھنے والوں کے بے بڑی نشانیاں ہیں۔ جب انھوں نے آپس میں کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی، دونوں ہمارے والد کو ہم سب زیادہ محبوب ہے۔
یہ معنی نبوت عطا کرے گا۔

۴ "تَاوِیْلَ الْاَحَادِیْثِ" کا مطلب محض تعبیر خواب کا علم نہیں ہے جیسا کہ گمان کیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے معاملہ فہمی اور حقیقت رسی کی تعلیم دے گا اور وہ بصیرت تجھ کو عطا کرے گا جس سے تو ہر معاملہ کی گہرائی میں اترنے اور اس کی تر کو پالینے کے قابل ہو جائے گا۔

۵ قرآن مجید کا یہ بیان بائبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے یہ خواب سن کر بیٹے کو خرب ڈانٹا اور کہا، اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ لیکن ذرا غور کرنے سے باسانی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضرت یعقوب کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسب رہتا ہے نہ کہ توراۃ و تلمود کا۔ حضرت یوسف نے خواب بیان کیا تھا، کوئی اپنی تنہا اور خواہش نہیں بیان کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا، اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب نے اس کی جو تعبیر نکالی وہ سچا خواب ہی سمجھ کر نکالی تھی۔ تو اس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسف علیہ السلام کی خواہش نہیں تھی بلکہ تقدیر الہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت ان کو یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار ایک معتمد آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر برامنے اور خواب دیکھنے والے کو لٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے اُندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کے بجائے اٹا جھل بھن جائے؟

۶ اس سے مراد حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یمن ہیں جو ان سے کئی سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوب ان دونوں بے ماں کے بچوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت ممدوح کی ساری اولاد میں صرف ایک یوسفؑ ہی ایسے تھے جن کے اندر آپ کو آثار رشد و سعادت نظر آتے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر حضرت یعقوبؑ نے
(باقی صفحہ ۲۳ پر)

حالانکہ ہم ایک پورا اجتماع ہیں، صاف نظر آتا ہے کہ ابا جان ہلک گئے ہیں۔ چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے
 ایسے پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے، یہ کام ہو جانے کے بعد پھر نیک
 بن رہنا۔ ان میں سے ایک نے کہا "یوسف کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی افسانے کنویں میں ڈال دو
 کوئی آتا جاتا تا فلہ اسے نکال لے جائے گا۔" اس قرار واد پر انھوں نے جا کر اپنے باپ کو کہا "ابا جان! کیا بات ہے

(بقیہ ماضیہ صفحہ ۱۴۹) جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اپنے اس بیٹے کی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب واقف
 تھے۔ دوسری طرف ان دس بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا اس کا افسانہ بھی لگے کے واقعات سے ہو جاتا ہے
 پھر کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک نیک انسان ایسی اولاد سے خوش رہ سکے لیکن عجیب بات ہے کہ بائبل میں برادران
 یوسف کے حسد کی ایک ایسی وجہ بیان کی گئی ہے جس سے اٹا الزام حضرت یوسف پر عائد ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت
 یوسف بھائیوں کی چھلیاں باپ سے کھایا کرتے تھے اس وجہ سے بھائی ان سے ناراض تھے۔

(حواشی صفحہ ۱۴۹) اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے برویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کوئی
 منظم ریاست موجود نہیں ہوتی اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں، وہاں ایک شخص کی قوت کا
 سارا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے کتنے ہیں جو وقت آنے پر اس کی جان وال اور
 آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی برہنہ، فطری طور پر آدمی کو
 وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں جو دشمنوں کے مقابلے میں کام آسکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بھائیوں نے کہا کہ ہمارے
 والد بڑھاپے میں بٹھیا گئے ہیں، ہم جو ان بیٹوں کا جتنا جو بڑے وقت ان کے کام آسکتا ہے، ان کو اتنا عزیز بنیے
 جتنے یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ان کے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ انے خود ہی حفاظت کے محتاج ہیں۔

یہ فقرہ ان لوگوں کے نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے جو اپنے آپ کو خواہشات نفس کے حوالے کر دینے
 کے ساتھ ایمان اور نیکی سے بھی کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی نفس ان سے کسی
 بڑے کام تقاضا کرتا ہے تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے اس کا تقاضا پورا کرتے ہیں اور ہمیشہ ایسے مواقع پر
 اپنے نیم جان ضمیر کو یہ کہہ کر تسلی دیدیا کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر، یہ ناگزیر گناہ، جس سے ہمارا کام اٹھا ہوا ہے، اگر گزرنے دے، پھر
 انشاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے کیچڑ چنگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل ہٹائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔ باپ نے کہا تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور تجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے کوئی بھڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو۔ انہوں نے جواب دیا "اگر ہمارے ہوتے اسے بھڑیے نے کھالیا، جبکہ ہم ایک جٹھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی تکتے ہوں گے۔" اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندسے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یوسف کو وحی کی کہ "ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو دن کی یہ حرکت بتائے گا یہ اپنے اس فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔" شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہنا اباجا ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھڑیا

لندہ بیان بھی بائبل اور تلمود کے بیان سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ براہ ان یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سکیم کی طرف گئے ہوئے تھے اور بعد میں حضرت یعقوب نے خود ان کی تلاش میں حضرت یوسف کو بھیجا تھا۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے حسد کا حال جاننے کے باوجود انہیں آپ اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں بھیجا ہو۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

۴۷ مَن مِّنْهُمْ لَا يَشْعُرُ وَنَ الْفَاكِهِ ايسے اعزاز سے آئے ہیں کہ ان سے تین معنی نکلتے ہیں اور تینوں ہی لگتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ تسلی دے رہے تھے اور اس کے بھائیوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ اس پر کیا وحی کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کی یہ حرکت انہیں بتائے گا جہاں تیرے ہونے کا انہیں وہم و گمان تک نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے بوجھ بوجھ ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں۔

بائبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف کنویں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انہوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن کا بیان پڑھیے تو عموماً ہوگا کہ ایک ایسے ترجمان کا بیان ہو رہا ہے جو ایک جلیل القدر منصب کے لیے نامزد ہو چکا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا

اگر اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔ اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔ یہ سن کر ان کے باپ نے کہا "بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنلوایا۔ اچھا صبر کروں گا، اور بخوبی کروں گا جو بات تم بنا رہے ہو اس پر امید ہی سے بردا لگی جاسکتی ہے۔"

اور ایک قافلہ آیا اور اس نے اپنے سے کوہانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقے نے جو کنویں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ) وہ پکار اٹھا کہ "مبارک ہو، یہاں تو ایک بڑا کام ہے۔" ان لوگوں نے اس کو مال تجارت سمجھ کر چھپایا حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انہوں نے اس کو کھٹوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔

(بقیہ ماحشیہ صفحہ ۲۴) نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنویں میں پھینک رہے ہیں اور وہ وہی کچھ کنڈلا ہے جو ہر لڑکا اس موقع پر کرے گا۔

(ہواشی صفحہ ۲۴) "ہے متن میں "صبر جمیل" کے الفاظ ہیں جس کا لفظی ترجمہ "اچھا صبر" ہو سکتا ہے۔ اس سے مراد ایسا صبر ہے جس میں شکایت نہ ہو، فریاد نہ ہو، خزع فزع نہ ہو، ٹھنڈے دل سے اس مصیبت کو برداشت کیا جائے جو ایک عالی ظرف انسان پر آپڑی ہو۔

یہ بائبل اور تلمود یہاں حضرت یعقوب کے تاثر کا نقشہ بھی ایسے انداز سے کھینچتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ "تب یعقوب نے اپنا پیرا بن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے پٹا اور ت دونوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔" اور تلمود کا بیان ہے کہ "یعقوب بیٹے کا قمیص پہنتے ہی اوندرھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا، پھر اٹھ کر بڑے زور سے چھا کر ہاں یہ میرے بیٹے ہی کا قمیص ہے..... اور وہ سا اسی سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا۔" اس نقشے میں حضرت یعقوب وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا۔ لیکن قرآن جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس میں ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ پر بار و بار وقار ہے، اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی اپنے دماغ کا توازن نہیں کھوتا، اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھی بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے اور پھر عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر بھی کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ بھی کرتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۲۴ پر)

مصر میں جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کریں ہمارے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹) اس سے معاملہ کی سادہ صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسف کو کنوئیں میں پھینک کر چلے گئے تھے، بعد میں قافلے والوں نے ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ برادران یوسف نے بعد میں اسماعیلیوں کے ایک قافلے کو دیکھا اور چاہا کہ یوسف کو کنوئیں سے نکال کر ان کے ہاتھ بیچ دیں۔ لیکن اس سے پہلے ہی دین کے سوداگر انہیں کنوئیں سے نکال چکے تھے، ان سوداگروں نے حضرت یوسف کو بیس روپے میں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر آگے چل کر بائبل مصنفین یہ بھول جاتے ہیں کہ اوپر وہ اسماعیلیوں کے ہاتھ حضرت یوسف کو فروخت کر چکے ہیں، چنانچہ وہ اسماعیلیوں کے بجائے پھر دین ہی کے سوداگروں سے مصر میں انہیں دوبارہ فروخت کرتے ہیں (ملاحظہ ہو کتاب پیرائش باب ۳۷- آیت ۲۵ تا ۲۸ و آیت ۳۶)۔ اس کے برعکس تلمود کا بیان یہ ہے کہ دین کے سوداگروں نے یوسف کو کنوئیں سے نکال کر اپنا غلام بنالیا، پھر برادران یوسف نے حضرت یوسف کو ان کے قبضہ میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا، آخر انہوں نے ۲۰ درہم قیمت ادا کر کے برادران یوسف کو راضی کیا۔ پھر انہوں نے بیس ہی درہم میں انہیں اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر انہیں فروخت کیا۔ یہیں سے مسلمانوں میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادران یوسف نے حضرت یوسف کو فروخت کیا تھا۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اس روایت کی تائید نہیں کرتا۔

(حواشی صفحہ ۱۲۸) بائبل میں اس شخص کا نام فوطیہ مار لکھا ہے۔ قرآن مجید آگے چل کر اسے ”عزیز“ کے لقب سے یاد کرتا ہے اور ایک دوسرے موقع پر ہی لقب حضرت یوسف کے یہ بھی استعمال کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بہت بڑا عمدہ دار یا صاحب منصب تھا، کیونکہ ”عزیز“ کے معنی ایسے بااقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جاسکتی ہو بائبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا، اور ابن جریر حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شاہی خزانے کا افسر تھا۔

تلمود میں اس عورت کا نام زلیخا (Zelicha) لکھا ہے اور یہیں سے یہ نام مسلمانوں کی روایات مشہور ہوا ہے۔ مگر یہ بات بالکل بے اہم ہے کہ بعد میں حضرت یوسف سے اس عورت کا نکاح ہوا۔ اس کو ذکر قرآن میں ہے نہ اسرائیلی تواریخ میں، اور ایک نبی کے مرتبے سے یہ بات بہت فروتر ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے نکاح کرے جس کی بد چلنی کا اس کو ذاتی تجربہ ہو چکا ہو۔۔۔

یہ مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سرزمین میں قدم جانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ قحط کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔

۱۵۔ تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر ۱۸ سال کی تھی اور فوطیفار ان کی شاندار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں پہنچ لائی ہے۔ چنانچہ جب وہ انھیں خرید رہا تھا اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ غلام تو نہیں معلوم ہوتا، مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چور لائے ہو۔ اسی بنا پر فوطیفار نے ان سے غلاموں کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے گھر اور اپنی کل املاک کا مختار بنا دیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ یوسف کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سواروٹی کے جسے وہ کھالیتا تھا اسے اپنی کسی چیز کا ہیش نہ تھا۔ (پیدائش ۳۹-۴۰)

۱۶۔ حضرت یوسف کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گدہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعاں اور شامی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم ریاست تھی اور نہ تمدن و تہذیب نے کوئی بڑی ترقی کی تھی۔ کچھ از قبائل تھے جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے، اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی بنائی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے پہلو میں قریب قریب وہی تھا جو آج کل ہندوستان کی شامی مغربی سرحد پر آزاد علاقہ کے قبائل کا ہے۔ یہاں حضرت یوسف کو جو تعلیم و تربیت ملی تھی اس میں برویا، زندگی کے محاسن اور خانوادہ ابراہیمی کی خدا پرستی و دینداری کے عناصر تو ضرور شامل تھے، مگر اللہ تعالیٰ اس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک، یعنی مصر میں ان سے جو کام لینا چاہتا تھا، اور اس کے لیے جس واقفیت، جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی اس کے نشو و نما کا کوئی موقع بروی زندگی میں نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انھیں سلطنت مصر کے ایک بڑے عمدے دور کے ہاں پہنچا دیا اور اس نے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر انھیں اپنے گھر اور اپنی جاگیر کا مختار کل بنا دیا۔ اس طرح یہ موقع پیدا ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشو و نما پا سکیں جو اب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں اور انھیں ایک چھوٹی جاگیر کے انتظام سے وہ تجربہ حاصل ہو جائے جو اس سلسلہ میں ایک بڑی سلطنت کا نظم و نسق چلانے کے لیے درکار تھا۔ اسی مضمون کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور حکم عطا کیا۔ اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اُس پر ڈور سے ڈالنے لگی اور ایک روز وہ دوازے بند کر کے بونی "آجا" یوسف نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں گا) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔" وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی

لہ قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم "نبوت عطا کرنا" ہوتا ہے۔ "حکم" کے معنی قوت فیصلہ کے بھی ہیں اور اقتدار کے بھی۔ پس اللہ کی طرف سے کسی بندے کو حکم عطا کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اسے انسانی زندگی کے معاملات میں فیصلہ کرنے کی اہلیت بھی عطا کی اور اختیارات بھی تفویض فرمائے۔ رہا "عظم" تو اس سے مراد وہ خاص علم حقیقت ہے جو انبیاء کو وحی کے ذریعہ سے براہ راست دیا جاتا ہے۔

عام طور پر مفسرین اور مترجمین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں میرے رب کا لفظ حضرت یوسفؑ نے اُس شخص کے لیے استعمال کیا ہے جس کی ملازمت میں وہ اُس وقت تھے اور ان کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ میرے آقا نے تو مجھے ایسی اچھی طرح رکھا ہے، پھر میں یہ نیک حرامی کیسے کر سکتا ہوں کہ اس کی بیوی سے زنا کروں۔ لیکن مجھے اس ترجمہ و تفسیر سے سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے اعتبار سے یہ مفہوم لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ عربی میں لفظ "رب" آقا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ بات ایک نبی کی شان سے بہت گری ہوئی ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔ اور قرآن میں اس کی کوئی نظیر بھی موجود نہیں ہے کہ کسی نبی نے خدا کے سوا کسی اور کو اپنا رب کہا ہو۔ آگے چل کر خود ہی سورہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے اور مصریوں کے سلک کا یہ فرق بار بار واضح فرماتے ہیں کہ ان کا رب تو اللہ ہے اور مصریوں نے بندوں کو اپنا رب بنا رکھا ہے۔ پھر جب آیت کے الفاظ میں یہ مطلب لینے کی بھی گنجائش موجود ہے کہ حضرت یوسفؑ نے رجب کلمہ اللہ کی ذات مراد لی ہو، تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک ایسے معنی کو اختیار کریں جس میں صریحاً قباحت کا پہلو نکلتا ہے۔

دلیل نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں، درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسف اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص (کینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی: کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا

۱۵ رب کی دلیل سے مراد وہی بات ہے جو اوپر حضرت یوسف نے اس عورت کی دعوتِ عیش کے جواب میں فرمائی تھی کہ میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برکام کروں، ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی۔ یہی وہ برہان رب تھی جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس یوزخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر مصیبت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس سے عصمتِ انبیاء کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ بنی کی مصیبت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور نفرت و خطا کی استعداد سلب کرنی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بنی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے محفوت ہونے کے وجود اور جملہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا، وہ اپنے دل و دماغ پر اپنے رب کی برہان کا ایسا تسلط رکھتا ہے کہ خواہشِ نفس کبھی اس کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی نفرت سرزد ہو جائے تو امرِ تقائی فوراً وحیِ جلی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرماتا ہے، کیونکہ اس کی نفرت تنہا ایک شخص کی نفرت نہیں ہے، ایک پوری امت کی نفرت ہے، وہ راہِ راست سے بال برابر ہٹا جائے تو دنیا گراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

۱۶ اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا دلیل رب کو دیکھنا اور گناہ سے بچ جانا ہماری توفیق و ہدایت سے ہوا کیونکہ ہم اپنے اس منتخب بندے سے بدی اور بے حیائی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے، اور یہ زیادہ گہرا مطلب ہے کہ یوسف کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلہ میں ایک ضروری مرحلہ تھا۔ ان کو بدی اور بے حیائی سے پاک کرنے اور ان کی طہارتِ نفس کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لیے صحتِ انفی میں یہ ناکڑ برٹھا کر ان کے سلفِ معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے اور اس آزمائش (باقی صفحہ ۲ پر)

ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے؟ یوسف نے کہا یہی مجھے پُسلار ہی تھی حالانکہ میں راضی نہ تھا۔ اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ اگر یوسف کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا، اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں (بقیہ ماثیہ صفحہ ۷۳) کے وقت وہ اپنے اردوے کی پوری طاقت پر ہیزگاری و تقویٰ کے پلڑے میں ڈال کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لیے قطعی طور پر شکست دیدیں۔

(حواشی صفحہ ۷۳) اس سے معاملہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ صاحب خانہ کے ساتھ خود اس عورت کے بھائی بتوں میں سے بھی کوئی شخص آ رہا ہو گا اور اس نے یہ قضیہ سن کر کہا ہو گا کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں اور موقع کا گواہ کوئی نہیں ہے تو قرینہ کی شہادت سے اس معاملہ کی یوں تحقیق کی جاسکتی ہے۔ بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہادت پیش کرنے والا ایک شیر خواہ بچہ تھا جو دباں چنگھورے میں لیٹا ہوا تھا اور غلے لے کر یا فی عطار کے اس سے یہ شہادت دلائی۔ لیکن یہ روایت نہ تو کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور نہ اس معاملے میں خواہ مخواہ معجزے سے مدد لینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے۔ اس شہادے قرینے کی جس شہادت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ سراسر ایک معمول شہادت ہے اور اس کو دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ایک معاملہ فہم اور جہاندیدہ آدمی تھا جو صورت معاملہ کے سامنے آتے ہی اس کی تہ کو پہنچ گیا۔

۷۴ مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف کا قمیص سامنے سے پھٹا ہو تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ اقدام یوسف کی جانب سے تھا اور عورت اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اگر یوسف کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس صاف ثابت ہوتا ہے کہ عورت اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور یوسف اس سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ قرینے کی ایک اور شہادت بھی اس شہادت میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ اس شاہد نے توجہ صرف یوسف علیہ السلام کے قمیص کی طرف دلائی۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورت کے جسم یا اس کے لباس پر تشدد کی کوئی علامت سرے سے پائی ہی نہ جاتی تھی، حالانکہ اگر یہ مقدمہ اقدام زنا بالجبر کا ہوتا تو عورت پر اس کے کھلے آثار پائے جاتے۔

بائبل اس اہم مضمون سے خالی ہے۔ البتہ تلمود کا بیان قرآن کے بیان سے بڑی حد تک متفق ہے۔ (باقی صفحہ ۷۴ پر)

واقعی بڑی غضب کی ہوتی ہیں تمھاری پائیں۔ یوسف! اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اسے عورت! تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تیری اصل میں خطا کا رتی۔ ۴

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے محبت نے اس کو بے قابو کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔ اس نے جوان کی یہ مکالمات سنیں تو ان کو بلا وایمچ دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس اراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھ دی (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسف کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ ڈنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں۔ اور بے ساختہ پکار اٹھیں "عاشا! بشر! یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔" عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم عہد پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے بھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہوگا۔" یوسف نے کہا "میرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے یہ تفسیر وہی دروازہ ہی پر چمک گیا تھا اور عزیز مصر نے اپنی بیوی کی تصور واپار کر اسے یوسف علیہ السلام سے معافی مانگنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن تلمود کی روایت یہ ہے کہ عزیز نے اپنی بیوی کی شکایت سن کر پہلے تو حضرت یوسف کو خوب پٹوایا، پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا اور حکام عدالت نے حضرت یوسف کے قصص کا جائزہ لے کر فیصلہ دیا کہ قصور عورت کا ہے۔ اب ہر شخص تھوڑے غور و تامل سے معلوم کر سکتا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں سے کوئی روایت زیادہ معتدل اور قرین قیاس ہے۔ کیا یہ باوجود کیا جاسکتا ہے کہ اتنے بڑے ایک ذی وجاہت آدمی نے ایسے ناز معاملہ کو جو اس کی ابرو سے تعلق رکھتا تھا، عدالت میں پیش کرنا پسند کیا ہوگا۔

(حواشی صفحہ ۱۷۹) لے مینی ایسی مجلس جس میں ہمانوں کے لیے کیے گئے ہوئے تھے۔ مصر کے آثار قدیمہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کی مجلسوں میں ٹکیوں کا استعمال بہت ہوتا تھا

بائبل میں اس عنیافت کا کوئی ذکر نہیں ہے البتہ تلمود میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے مگر وہ قرآن سے بہت مختلف ہے۔ قرآن کے بیان میں جو زندگی، جو روح، جو فطرت اور جو اخلاقیات پائی جاتی ہے اس سے تلمود کا بیان بالکل خالی ہے۔

لے اس سے آوازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے

قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چاہوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۱) جن عورتوں کو بلایا ہو گا وہ امرا اور دُسا اور پڑے عمدہ فاروں کے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی۔ ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوبصورت جوانی دکھا کر انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوان دنا پر اگر میں مرضی تو اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا۔ پھر بڑے گھروں کی بہو بیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو نگیم عزیز نے کیا۔ پھر شریف خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو ملانیہ اپنے اس غم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر میرا یہ غلام میرے ساتھ زنا کرنے پر راضی نہ ہوا تو میں اسے قید کر دوں گی۔ یہ سب کچھ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ یورپ اور امریکہ آج عورتوں کی جس آزادی و بے باکی کو بیسویں صدی کی ترقیات کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بہت پرانی چیز ہے، دقیانوس سے بھی سینکڑوں برس پہلے مصر میں یہ اسی شان کے ساتھ پائی جاتی تھی جیسی آج اس روشن زمانے میں پائی جا رہی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۵۱) یہ آیات ہمارے سامنے ان حالات کا ایک عجیب نقشہ پیش کرتی ہیں جن میں اس وقت حضرت یوسف مبتلا تھے۔ انیسویں سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو بدولت و مروت سے بہترین تندرستی اور بھری جوانی لیے ہو آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور جبری غلامی کے مراحل سے گزرنے کے بعد قسمت اسے دنیا کی سب سے بڑی تمدن سلطنت کے پایہ تخت میں ایک بڑے رئیس کے ہاں لے آئی ہے۔ یہاں پہلے تو خود اس گھر کی نگیم ہی اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے جس سے اس کا شب و روز کا سابقہ ہے۔ پھر اس کے حسن کا ہر چارے دار السلطنت میں پھیلتا ہے اور شہر بھر کے امیر گھرانوں کی عورتیں اس پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک طرف وہ ہے اور دوسری طرف سینکڑوں خوبصورت جال ہیں جو ہر وقت ہر جگہ اسے پھانسنے کے لیے پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی تدبیریں اس کے جذبات کو بھڑکانے اور اس کے ذہن کو توڑنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ جدھر جا سکے یہی دیکھتا ہر گناہی ساری خوشنمائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ دروازہ کھولے اس کا منظر کھڑا ہے۔ کوئی تو فور کے مواقع خود ڈھونڈتا ہے، مگر یہاں مواقع خود اس کو ڈھونڈ رہے ہیں اور اس تاک میں لگے ہوئے ہیں کہ جس وقت بھی اس کے ذہن میں برائی کی طرف ادنیٰ میلان پیدا ہو وہ فوراً اپنے آپ کو اس کے

(۱۵۱ صفحہ ۲ پر)

اس کے رب نے اس کی وعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں۔ بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

پھر ان لوگوں کو یہ سو بھی کہ ایک مدت کے لیے اسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاکدامنی اور خود اپنی عورتوں کے برے اظہار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ ۴

(بقیہ ماضیہ صفحہ ۲۷) سامنے پیش کر دیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے وہ اس خطرے میں بسر کر رہا ہے کہ کبھی ایک لمحہ کیے بھی اس کے ارادے کی بندش میں کچھ ڈھیل آجائے تو وہ گناہ کے ان بے شمار دروازوں میں سے کسی میں داخل ہو سکتا ہے جو اس کے انتظار میں کھلے ہوئے ہیں۔ اس نگرانی کا حال یہ ہے کہ:

شہریت پر زخوباں وز بہر طنگا رے یاں صلائے عام است گری کنید کارے

اس حالت میں یہ خدا پرست نوجوان جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتا ہے وہ بجائے خود کچھ کم قابل تعریف نہیں ہے، مگر ضبط نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عریان نفس اور طہارت فکر کا فرید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی اس کے دل میں کبھی یہ تنکبرانہ خیال نہیں آتا کہ وہ رے میں کسی مضبوط ہے میری سیرت کہ ایسی ایسی حسین اور جوان عورتیں میری گردیدہ ہیں اور پھر بھی میرے قدم نہیں پھسلتے۔ اس کے بجائے وہ اپنی بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کرتا ہے کہ اے رب، میں ایک کمزور انسان ہوں، میرا قابل ہوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں، تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا، ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں۔ حقیقت یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی تربیت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ دیانت، امانت، عفت، حق شناسی، راست روی، انضباط اور توازن ذہنی کی غیر معمولی صفات جو اب تک ان کے اندر چھپی ہوئی تھیں اور جن سے وہ خود بھی بے خبر تھے، وہ سب کی سب اس شدید آزمائش کے دور میں ابھر آئیں، پورے زور کے ساتھ کام کرنے لگیں اور انھیں خود بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے اندر کون کون سی قوتیں موجود ہیں اور وہ ان سے کیا کام لے سکتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ۲۸) ۵ دفع کرنا اس معنی میں ہے کہ یوسف علیہ السلام کی سیرت صالحہ کو ایسی مضبوطی بخش دی گئی جس کے مقابلہ میں ان عورتوں کی ساری تدبیریں ناکام ہو کر رہ گئیں۔

۶ اس طرح حضرت یوسف کا قید میں ڈالا جانا حقیقت ان کی اخلاقی فتح اور مصر کے پورے طبقہ اعلا کے (باقی صفحہ ۲۸)

قید خانہ میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے۔ ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں۔" دوسرے نے کہا "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں۔" دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں۔" یوسف نے کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) حکام کی اخلاقی شکست کا اتمام و اعلان تھا۔ اب حضرت یوسف کوئی غیر معروف اور گناہ آدمی نہ رہے تھے بلکہ ہیں، اور کم از کم دارالسلطنت میں تو عام و خاص سب ان سے واقف ہو چکے تھے جس شخص کی دل فریب شخصیت پر ایک دو نہیں، اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی خواتین فریفتہ ہوں، اور جس کے فتنہ روزگار حسن سے اپنے گھر گزرتے دیکھ کر مصر کے حکام نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی ہو کہ اسے قید کر دیں، ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ ضرور ہے کہ گھر گھر اس کا چرچا پھیل گیا ہو اور عام طور پر سب لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو کہ یہ شخص کیسے بلند اور مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے اور یہ بھی کہ اسے جیل اپنے کسی جرم پر نہیں بھجا گیا ہے بلکہ اس لیے بھجا گیا ہے کہ مصر کے امرا اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنے کے بجائے اس بے گناہ کو بھلی بھیج دینا زیادہ آسان پاتے تھے۔

(حواشی صفحہ ۲۸) غائباً اس وقت جبکہ حضرت یوسف قید کیے گئے ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے نکال کر جب وہ مصر کے فرما تر و ابناے گئے تو ان کی عمر تیس سال کی تھی اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں وہ بضع سنین یعنی کئی سال رہے۔ بضع کا اطلاق عربی زبان میں دس تک کے عدد کے لیے ہوتا ہے۔

۱۷ یہ دو غلام جو قید خانہ میں حضرت یوسف کے ساتھ داخل ہوئے تھے ان کے متعلق بائبل کی روایت ہے کہ ان میں سے ایک شاہ مصر کے سابقوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی نان بانیوں کا افسر۔ تلمود کا بیان ہے کہ ان دونوں کو شاہ مصر نے اس تصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کریرا ہٹ پائی گئی تھی اور شراب کے ایک گلاس میں کھی نکل آئی تھی۔

۱۸ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسف کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اور چرن وقت کا ذکر گند چکا ہے ان کو پیش زار رکھنے سے یہ بات قابلِ تعجب نہیں رہتی کہ ان دو قیدیوں نے آخر حضرت یوسف ہی سے اگر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی اور ان کی خدمت میں یہ نذر عقیدت کیوں پیش کی کہ إِنَّا نُرِيكَ مِنَ الْمُسْتَنِينَ۔ (باقی صفحہ ۲۹ ہے)

”یہاں جو کھانا تھیں ملا کرتا ہے اس کے اُسنے پہلے میں تھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔
 یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا
 طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحق،
 اور یعقوب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ حقیقت
 یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ نہیں بنایا) مگر
 اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں
 یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا
 کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے
 کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کے اختیارات اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں، اس کا حکم
 ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو، یہی ٹھیک سیدھا طریقہ زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں
 ہیں، اے زنداں کے ساتھیو! تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر)
 کو شراب پلائے گا، بادوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں
 گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے۔“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ کوئی مجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس آدمی ہے۔ سخت
 آزمائشوں میں وہ اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے کر آئے تھے۔ مصر کا بچہ بچہ جان چکا تھا کہ آج پورے ملک میں ان سے زیادہ
 نیک انسان کوئی نہیں ہے حتیٰ کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں بھی ان کی نظیر مفقود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت
 کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ خود قید خانے کے حکام اور اہل کار بھی ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ چنانچہ بائبل میں ہے کہ قید خانے کے
 داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے یوسف کے ہاتھ میں سوپا اور جو کچھ وہ کرتے اسی کے حکم سے کرتے تھے، اور قید خانے
 کا داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے بے فکر تھا۔ (پیدائش ۳۹: ۲۲-۲۳)

حاشیہ صفحہ ۲) اے یہ تقریر جو اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کی بہترین تقریروں میں سے ہے،
 بائبل اور تلمود میں کہیں اس کی طرف ادنیٰ اشارہ تک نہیں ہے۔ وہ حضرت یوسف کو محض ایک دانشمند اور پرہیزگار آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹) کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں۔ مگر قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی سیرت کے ان پہلوؤں کو بھی بائبل اور تلمود کی بنیاد بہت زیادہ روشن کر کے پیش کرتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ وہ ہم کو یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف اپنا کپ پینیر و دشن رکھتے تھے اور اس کی دعوت و تبلیغ کا کام انھوں نے قید خانہ ہی میں شروع کر دیا تھا۔

یہ تقریر ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے کوئی سرسری طور پر گزر جائیے، اس کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور فکر کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) یہ پہلا موقع ہے جبکہ حضرت یوسف دین حق کی تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی داستان حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مرحلوں پر ابھرتی رہی ہیں تبلیغ کا کوئی نشان وہاں نہیں پایا جاتا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے مراحل محض تیزی اور تربیت کے تھے۔ نبوت کا کام عملاً اب اس قید خانے کے مرحلے میں ان کے سپرد کیا گیا ہے اور نبی کی حیثیت سے ان کی پہلی تقریر دعوت ہے۔

(۲) یہ بھی پہلا ہی موقع ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اہلیت ظاہر کی اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی۔ جب قافلے نے ان کو کمر کر غلام بنا کر جب وہ مصر میں لائے گئے، جب انھیں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا، جب انھیں جیل بھیجا گیا، ان میں سے کسی موقع پر بھی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم و اسحاق علیہ السلام کا پوتا اور یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے خواہ اہل مدین تھے یا سامعی، دونوں ان کے ہم نسل ہی تھے، اہل مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیم سے تو ناواقف نہ تھے۔ لیکن حضرت یوسف نے کبھی باپ و داد کا نام نہ کر دیا، آپ کو ان حالات میں نہ جاننے کی کوشش نہ کی، چنانچہ وہ پچھلے چار یا پانچ سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انھیں بنا رہا ہے اس کے لیے ان کا ان حالات سے گزرنا ہی ضروری ہے۔ مگر اب انھوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوت توحید کی اُس عالمگیر تحریک سے ہے جس کے ائمہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھا کر تاکہ وہ ایکسٹنٹی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سوجھی تھی، بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں اس ازنی و ابدی حقیقت کی طرف اشارہ ہوں جو ہمیشہ سے تمام (باقی صفحہ ۳۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔

(۳) پھر حضرت یوسف نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا اس میں ہم کو حکمت تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ وہ آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدتِ سندی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا مگر پہلے یہ سن لو کہ اس ظلم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ ان کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں گت تبلیغِ حق کی دھن سنائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی اس کے سامنے تو مواقع پر مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا۔ مگر جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اُس نادان مبلغ کی بھونٹنی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے لیچر پن اور جھگڑاؤں سے انہیں الٹا متفر کر کے جھوٹا ہے۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوتِ دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسف چھوٹے ہی دین کے تفسیری اصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دیتے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اس باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقلِ عام رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہوگی کیونکہ وہ ذہن کریشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا، اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آ جاؤ، بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو، اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود کو گھڑا گھڑا کر اپنے رب بناتے اور ان کی ہندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسف نے کہا کہ ۱۳۔ اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا۔ مگر شیطان نے اسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف کئی سال قید خانے میں گزارا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) کے ہر شاہ کے بغیر بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا، کسی کو خداؤ، نعمت، کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو، یہ سب محض خالی خولی نام ہی ہیں، ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتی و خداوندی ہمالیہ نہیں ہے۔ پس مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے جسے تم بھی گناہ کا خالق و رب تسلیم کرتے ہو، ان میں سے کسی نے یہ بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں تیار کی ہے۔ اس نے تو فرما کر دیا کہ سارے اختیارات اپنی ہی ہاتھ میں رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(۵) اس سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت یوسف نے قید خانے کی زندگی کے یہ آٹھ دس سال کس طرح گزارے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چونکہ ان کے ایک ہی وعظ کا ذکر ہے اس لیے انھوں نے صرف ایک ہی دفعہ دعوت دین کے لیے زبان کھولی ہوگی۔ مگر اول تو ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان کرنا ہی سخت بدگمانی ہے کہ وہ اپنے اصل کام سے غافل ہوگا۔ پھر جس شخص کی تبلیغی دھن کا حال یہ تھا کہ وہ آدمی تبصر خواب پر چھتے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تبلیغ شروع کر دیتا ہے، اس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس نے قید خانے کے یہ چند سال خاموش ہی گزار دیے ہوں گے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۵) اس مقام کی تفسیر بعض مفسرین نے یہ کی ہے کہ شیطان نے حضرت یوسف کو اپنے رب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی یاد غافل کر دیا اور انھوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ اپنے رب (یعنی شاہ مصر) سے ان کا تذکرہ کر کے ان کی رہائی کی کوشش کرے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں رہے۔ و حقیقت یہ تفسیر بالکل غلط ہے، صحیح یہی ہے، جب کہ علامہ ابن کثیر، اور مقدسین میں سے بجا ہر اور محمد ابن اسحاق وغیرہ نے کہا کہ فالنساء الشیطان ذکر دہر کی ضمیر اس شخص کی طرف پھرتی ہے جس کے متعلق حضرت یوسف کا گمان تھا کہ وہ رہائی پانے والا ہے، اور اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ شیطان نے اسے اپنے آقا سے حضرت یوسف کا ذکر کرنا بھلا دیا، اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یوسف علیہ السلام نے وہ بات نہ کہی ہوتی جو انھوں نے کہی تو وہ قید میں کئی سال نہ پڑے رہتے۔ لیکن علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جتنے طریقوں سے روایت کی گئی ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ بعض طریقوں سے یہ مرفوع روایت کی گئی ہے اور ان میں سفیان بن دیکیع اور ابراہیم بن یزید راوی ہیں جو دونوں ناقابل اعتماد ہیں۔ اور بعض طریقوں سے یہ مرفوع روایت ہوئی ہے اور ایسے معاملات میں مرسلات کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ بریں درایت کے اعتبار سے بھی یہ بات باطل کرنے کے قابل نہیں ہے کہ ایک مقدم شخص کا اپنی رہائی کے لیے یہ نبوی تدبیر کرنا خدا سے غفلت اور توکل کے فقدان کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔